ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو، علّامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

”مسدّسِ حالیؔ“: صحیفۂ تنبیہ الغافلین

Musaddas e Hali is an epoch-making poem. It is a lament at the disgrace of Muslims suffered after giving a civilization to the world. This poem infused a spirit in hearts of Muslims of the colonial India. The article stresses that Musaddas e Hali is relevant event today as it awakens people from deep slumber. It’s translations in Eastern and European languages prove that it may become a beacon house for the coming generations also.

برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کا سیاسی اور تہذیبی زوال اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے نااہل اور عیش پرست جانشین ہوا وہوس کا شکار ہو کر باہم صف آرا ہو گئے تو اس خانہ جنگی اور باہمی آویزش کے باعث کاروبارِ حکومت اُن کے ہاتھوں سے نکلنے لگی۔ صوبے اور ریاستیں مرکز سے ٹکرا کر الگ اور خود مختار ہونے لگیں۔ بیرونی طاقتیں حملہ آور ہوئیں اور زوال آمادہ مغل حکمرانوں کو مزید مشکلات سے دوچار کر گئیں۔ شورشوں، بغاوتوں اور محلاتی سازشوں نے بہت جلد مرکزیت کے شیرازے کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان حالات میں ہندوستان پر قبضے کا خواب دیکھا اور نہایت برق رفتاری سے اس کی تعبیر کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئی۔ اوّل اوّل اس نے ریاستوں کو باہم ٹکرا کر کمزور کرنے کی حکمتِ عملی ترتیب دی اور جب وہ آپس میں ٹکرا کر کمزور ہو گئیں تو یکے بعد دیگرے ان کی گردنوں پر اپنے آہنی پنجے گاڑ کر انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع وباج گزار بنا لیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ریاستوں اور صوبوں کے حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ عظیم مغلیہ اقتدار سمٹتے سمٹتے دہلی کے لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اہلِ ہند نے جب اپنی گردنوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت مضبوط ہوتے دیکھی تو پل بھر کے لیے پھڑپھڑانے کا جتن کیا مگر اب وقت گزر چکا تھا اور اس آہنی شکنجے سے نکلنا اب ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی، قیادت کے فقدان ، ایک دوسرے پر عدمِ اعتماد اور مناسب حکمت عملی

کے نہ ہونے کے باعث ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ،اہلِ ہند کے لیے مستقل غلامی کا عنوان بن گئی۔آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفرؔ کو گرفتار کر کے رنگون کے قلعے میں اسیر کر دیا گیا جہاں وہ بے بسی وبے کسی کی تصویر بنا،قید خانے کے درودیوار سے سر ٹکراتے ٹکراتے راہیِ ملکِ بقا ہوا۔پورے ہند پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا اور یوں برطانیہ کا نوآبادیاتی دائرہ وسعت آشنا ہوا۔

انگریزی اقتدار نے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کی بساط لپیٹ دی۔سیاسی، تمدنی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی نظام قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے۔انگریزوں نے نہایت ہوشیاری اور حکمتِ عملی سے ہندوستانیوں کو باہم لڑا کر ان کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا۔انھوں نے چوں کہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور وہ مسلمانوں کے شان دار ماضی سے بھی باخبر تھے ،اس لیے ہندوستان میں اگر انھیں کسی قوم سے خطرہ تھا تو وہ مسلمان تھے۔اس خطرے کے پیشِ نظر انھوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور ان پر عرصۂ زیست تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اعتراف کرتا ہے:

> " حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمتِ عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔غیر سرکاری ذرائعِ زندگی میں بھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔"[۱]

ایک طرف عیسائی مشنری قریہ قریہ ،بستی بستی گھوم کر اسلام کے چشمۂ صافی کو گدلانے اور سادہ لوح اور ناخواندہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات کا زہر گھولنے میں مصروفِ عمل تھے تو دوسری طرف ہندو، انگریزوں کے ایما پر اور مسلمانوں کے خلاف اپنے فطری بغض کے باعث انھیں مسلسل تنگ کرنے اور تکلیف پہنچانے میں جُتے ہوئے تھے۔ان حالات میں مسلمان سماجی ابتری،اقتصادی زبوں حالی اور شکست خوردگی کے احساس کا شکار ہو کر حسرت ویاس کی تصویر بن گئے۔ان سے زندگی کے منظر نامے پر فعال کردار ادا کرنے کی لگن چھن گئی ، حالات کی سنگینی نے ان پر موت کی حالت طاری کر دی۔قوم کے امرا اور اکابر اگرچہ دردمندی اور اخلاص سے اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے مگر ان کی تدابیر کا دائرہ محدود اور اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔بعض رہنما

مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی استعمار کے خلاف نفرت کا بیج بو رہے تھے اور بعض انھیں انگریزوں کی ہم نوائی کا درس دے رہے تھے۔مولانا الطاف حسین حالیؔ(۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) حالات وواقعات کی اس سنگینی کے چشم دید گواہ تھے اور ان کا دلِ دردمند مسلمانوں کی اس ابتری اور درماندہ حالی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔وہ مسلمانوں کو اس گرداب سے نکالنے کے متمنی اور زندگی کے منظر نامے پر انھیں آبرومندانہ مقام پر دیکھنے کے آرزو مند تھے۔مسدّسِ حالیؔ ان کے اسی جوشِ احساس کا نقشِ لازوال ہے۔انھوں نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی کو نہایت دردمندی اوردل سوزی کے ساتھ بیان کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیرت دلانے اور ان میں دینی حمیت کو بیدار کر کے انھیں زندگی کے منظر نامے پر ابھرنے کا درس دیا۔(۲)

مولانا الطاف حسین حالیؔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔کم سنی میں والدین کے سائے سے محرومی اور گھر کے ناموافق حالات کے باعث ان کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔اپنے ذوق وشوق اور طلبِ علم کی بدولت انھوں نے پانی پت اوردہلی میں عربی فارسی کی کُچھ تعلیم حاصل کی۔شاعری کا ذوق فطری تھا۔مرزا غالبؔ سے شاعری پر اصلاح لی۔نواب مصطفی خاں شیفتہؔ کی مصاحبت نے ان کو بہت متاثر کیا۔شیفتہؔ سے استفادے کا اعتراف کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

> "مرزا (غالب) کے مشورہ واصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا،بلکہ جو کُچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا،منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔۔۔۔ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔''(۲)

نواب شیفتہؔ کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد وہ لاہور آ گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔یہاں انگریزی کتابوں کے اُردو تراجم کی درستی ان کے فرائض میں شامل تھی۔انجمنِ پنجاب کی تحریک میں وہ عملاً شریک ہوئے۔لاہور میں ہی کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی اور مولانا

محمد حسین آزادؔ کی رفاقت نے ان کے خیالات میں یک سر تبدیلی پیدا کر دی اور وہ مشرقی ادبیات سے متنفر ہونے لگے،وہ اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اورخاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہو نے لگی۔"(۳)

لاہور کے چار سالہ قیام نے ان کے خیالات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ؛مشرقی ادبیات کے ذخیرے کو وہ سوختنی سمجھنے لگے اور شعر وادب کی فوری اصلاح کا خیال ان کے دامن گیر ہو گیا۔اس عرصے میں سرسید احمد خان اور علی گڑھ سے بھی اُن کا تعلق استوار ہوا؛جس نے ان کے اس خیال کو مزید تحرک بخشا۔ اینگلو عربک اسکول، دہلی میں مدرسی کے زمانے میں سرسید احمد خان کی فرمائش پر انھوں نے مسدّس لکھنا شروع کیا۔مسدّس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

" قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے(جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پُرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے،اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کُچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
ور جمادی لافِ انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے ،عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پُکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کُچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں،غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ایسے میں جس سے جو کُچھ بَن آئے سو بہتر ہے۔ورنہ

ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصّہ ہے،قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی ،اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہو گا۔۔۔۔۔۔۔ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھامگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔دل ہی سے نکلی تھی، دل میں جا کر ٹھہری۔برسوں کی بُجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے،انھی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈالی۔دُنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا، مگر ہر حال میں یہ دھُن لگی رہی۔بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہو گئی اور ناصحِ مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔''(۴)

حالیؔ سے مسدّس کی فرمائش اگرچہ سرسیّد نے کی تھی مگر انھیں اندازہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی اتنے مؤثر پیرائے میں اتنی قدرت اور مہارت کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالی بھی جا سکتی ہے۔حالیؔ اگرچہ اسے ایک ''ٹوٹی پھوٹی نظم'' قرار دیتے ہیں اور ''نازک خیالی ''اور'' رنگین بیانی'' سے عاری اور ''مبالغے کی چاٹ'' اور تکلف کی چاشنی''سے تہی ایک'' اُبالی کھچڑی'' کہتے ہیں مگر ۱۸۷۹ء میں جب یہ چھپ کر سامنے آئی تو سرسید احمد خان اس سے بے حد متاثر اور مرعوب ہوئے اور انھوں نے اپنے خط(مرقومہ: ۱۰/جون ۱۸۷۹ء) میں مولانا حالیؔ کوخراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

> "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی،جب تک ختم نہ ہو لی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہو لی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے،بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ ، تشبیہاتِ دوزازکار سے جو مایۂ نازِ شعرا وشاعری ہے،بالکل مبرا ہے،کیوں کر ایسی خوبی وخوش بیانی اور مؤثر طریقہ پر

ادا ہوا ہے۔متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے۔حق ہے جو دل سے نکلتی ہے،دل میں بیٹھتی ہے۔''(۵)

سر سیّد احمد خان اس بات پر بھی بہت مفتخر تھے کہ مسدّس کی تخلیق ان کی فرمائش کا نتیجہ ہے۔وہ مسدّس کی اشاعت پر بہت خوش اور مسرور ہوئے اور مولانا حالیؔ کو لکھا:'' بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ حالیؔ سے مسدّس لکھوا لایا ہوں۔''(۶) اگر چہ مسدس حالیؔ سرسید ہی کی تحریک پر معرضِ وجود میں آئی تاہم یہ خیال کرنا درست نہیں کہ مسدّس سراسر ایک فرمائشی تخلیق ہے اور حالیؔ نے محض سرسیّد کے کہنے پر مسلمانوں کی تاریخ کو نظم کر دیاہے۔مسدّس کے ایک ایک مصرعے میں حالیؔ کا دلِ دردمند دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔یہ ان کے باطن کی آواز اور ان کے احساسِ دروں کااظہار یہ ہے۔سر سیّد احمد خان نے مسدّسِ حالی کا جیسا والہانہ استقبال کیا،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسی ہی انقلاب آفریں نظم کاخواب دیکھا تھا۔مولانا حالیؔ نے مسدّس کے حقوقِ تصنیف مدرسۃ العلوم کو دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو سرسیّد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں لکھا:

" آپ کے اس خیال کا کہ حقِ تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے ،میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدّس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے۔جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طلبہ سارنگی پر گاویں؛قوال درگاہوں میں گاویں؛ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں،اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔''(۷)

مسدّسِ حالیؔ کا اصل نام مدوجزرِ اسلام ہے اور واقعتاً یہ اپنے نام کی طرح مسلمانوں کے عروج وزوال، فراز ونشیب اور بلندی وپستی کی کہانی ہے۔اس کہانی کا آغاز عرب اور اہلِ عرب کی حالتِ زار سے ہوتا ہے۔مبالغے اور دورازکار تشبیہات واستعارات سے عاری ہونے کے باوجود واقعات اور حالات کی چلتی پھرتی تصویر پیش کردینا معجزۂ فن اور قدرتِ کلام کی دلیل ہے ؛سچی تڑپ اور حقیقی سوز کے بغیر

تاریخی حالات وواقعات کے بیان میں تاثیر اور دل پذیری پیدا نہیں ہو سکتی۔حالیؔ کے معجز بیان قلم نے حقیقی واقعات کے قالب میں وہ روح بیدار کر دی ہے جو پڑھنے سُننے والوں کے دلوں میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے۔اہلِ عرب کی جہالت اور وحشت کا بیان ملاحظہ ہو:

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اِک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اَڑ بیٹھتے تھے
سُلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لَڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا
وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اِک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اِک اُن کی جہالت کا تھا وہ

طلوعِ اسلام ، رسولِ کائنات ﷺ کے مثالی کردار، مسلمانوں کی جدوجہد اور دُنیا بھر میں ان کے علم و عمل اور اوصاف وکمالات کی تصویر کشی میں مولانا حالیؔ نے خونِ جگر صرف کر دیا ہے۔سادگی

اور صفائی ،پاکیزگی اور برجستگی مصرع بہ مصرع بلکہ لفظ بہ لفظ سفر کرتی نظر آتی ہے۔مسلمانوں کے زوال کی اندوہ ناک تصویروں اور ان کی بے عملی، تعصب، جہالت، خود غرضی، بے حمیتی اور بے بصری کے ٹھیک ٹھیک نقشوں میں حالیؔ کے قلب کا گداز اور ان کی آنکھوں کا نم چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ظاہر دار عالموں ریاکار اور شعبدہ باز پیروں، کج فہم حکیموں، بے حس شاعروں اور متکبر امیروں کی قلعی جس انداز میں کھولی گئی ہے اس سے حالیؔ کی دردمندی اور تڑپ کی عکاسی ہوتی ہے:

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ حقیقت
مقام ان کا ہے ماورائے شریعت
انھیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت
انھیں کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی بایزید اب
بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے
تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے
تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اس کا نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

مسدس ِ حالیؔ نے شائع ہوتے ہی ہر طرف گویا آگ لگا دی۔قعرِ مذلت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں نے اپنے عروج وزوال کی کہانی کو پڑھا تو دھاڑیں مارمار کر رونے لگے۔نام نہاد مولویوں،بے عمل عالموں،جعلی پیروں اور چرب زبان ادیبوں اور خوشامدی شاعروں نے مسدّس کے آئینے میں اپنی مکروہ تصویریں دیکھیں تو اپنی اصلاح کے بجائے آئینے پر سنگ باری شروع کر دی۔حالیؔ کے کردار،ان کے مذہبی خیالات، ان کی فرنگ دوستی اور مسدّس میں زبان وبیان کی غلطیوں اور ردیف وقوافی کی ناہمواریوں کو چھچھورے اور عامیانہ انداز میں بیان کرنے لگے،خیالی، ڈفالی اور خالی جیسے مضحکہ خیز ناموں سے مسدّس کے جواب لکھے گئے مگر بہت جلد یہ سب ہنگامے فرو ہو گئے اورمولانا حالیؔ کے مخالفین حسد وبغض کی اس آگ میں خود ہی جل کر بھسم ہو گئے۔حالیؔ کی دردمندی سکۂ رائج الوقت ٹھہری اور اس کا کلام مسجدوں، درگاہوں، گھروں، اسکولوں، مدرسوں، گلیوں، بازاروں اور مجلسوں میں پڑھا جانے لگا۔نصابوں میں شامل ہوا اور دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس بے نظیر نظم کے تراجم ہوئے۔حالیؔ نے مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو جس دقتِ نظر سے دیکھا اور مسلمانوں کے زوال کے داخلی اسباب کی جس طرح نشان دہی کی وہ ان کے تبحرِ علمی اور تاریخِ اسلام سے ان کی باخبری کی دلیل ہے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ان کے شعورِ تاریخِ اسلام کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "مسدّس میں شیرازۂ ملت کے اجزائے پریشاں کے انفرادی انحطاط و انتشار کی تفصیل یا خارجی طاقتوں کی سازشوں اور آویزشوں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن حالیؔ نے زوال کے داخلی اسباب کا تجزیہ اس خوبی سے کیا ہے اور موجودہ حالات کی ایسی مفصل ومکمل تصویر پیش کی ہے کہ ہمیں ملت کے عروج وزوال کی اس داستان میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ملتِ اسلامیہ کی سیزدہ صد سالہ زندگی کی طویل داستان،نسبتاً ایک نظم میں بیان کرنے کے لیے فنی ہنر مندی کے علاوہ تاریخی عوامل کے واضح شعور اور صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ضرورت تھی۔حالیؔ جانتے تھے کہ مدوجزرِ اسلام کی کہانی عرب وعجم کے شاہ نامے سے کس حد تک مختلف ہو گی لہٰذا انھوں نے رزم وبزم اور حرب وضرب کے ہزاروں کارناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ان بنیادی

اقدار پر اپنی توجہ مرکوز رکھی جس کے فروغ یا فقدان پر اسلامی تحریک کے عروج یا زوال کا انحصار تھا۔''(۸)

مسدّسِ حالی کا پہلا ایڈیشن۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔مسدّس کا اختتام ایسے اشعار پر ہوتا تھا جن میں مایوسی اور قنوطیت کا رنگ غالب تھا۔قوم وملت کا درد رکھنے والے اکابر نے حالیؔ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور تقاضا کیا کہ اس میں ایسے اشعار شامل کیے جائیں جو مایوسی کی دلدل میں دھنسے لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑا کر انھیں پھر سے آمادۂ عمل کر سکیں۔حالیؔ نے ۱۸۸۶ء میں ۱۶۲ بند کا ضمیمہ شامل کر دیا جس میں امید اور رجائیت کا مضمون سو رنگوں سے بیان کیا۔بے عملی، تغافل کیشی، کاہلی اور سستی کی مذمت اور حرکت وعمل کی توصیف اس انداز سے کی کہ قلب ونظر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

مسدّسِ حالی اپنی طرز کی پہلی نظم ہے۔دُنیا کی مختلف زبانوں اور ادبیات میں نظم کی ایسی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔یہ نظم صحیح معنوں میں اُردو میں قومی وملی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے۔تاثیر میں ڈوبی اس نظم نے بلاشبہ لاکھوں مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں غیرتِ ایمانی اور حمیتِ قومی کا احساس ابھارنے کا فریضہ ادا کیا۔اپنی سادگی اور دل کشی کے باعث یہ صرف طبقۂ خواص ہی میں مقبول نہیں ہوئی بلکہ عوامی حلقوں میں بھی قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔شیخ محمد اکرام مسدّس کے دائرۂ اثر کو علی گڑھ کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے زیادہ وسیع قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسدّس نے قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقے تک پہنچایا ،جہاں علی گڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔ان دونوں کا حلقہ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود تھا لیکن مسدّس کی سادہ زبان اور سیدھے سادے خیالات جتنے خواص کو مرغوب تھے اتنے ہی عوام کو عزیز تھے۔''(۹)

مولانا الطاف حسین حالیؔ، سرسیّد احمد خان کے اوصاف وکمالات کے معترف اور ان کی تعلیمی وقومی خدمات کے سچے قدردان تھے اور انھیں اپنا محسن، ہمدرد اور مربّی خیال کرتے تھے مگر وہ ان کے مقلدِ محض نہ تھے۔حکومت کی تعریف وتوصیف میں اگر وہ سرسیّد کے خیالات سے متاثر دکھائی دیتے ہیں تو عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں سرسیّد کے نقطۂ نظر کے خلاف بھی کھڑے نظر آتے

ہیں۔سرسیّد کے مذہبی خیالات اور معتقدات سے بھی حالیؔ کو کُچھ علاقہ نہ تھا۔وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور توحید ورسالت، دُنیا وآخرت، جزا وسزا، عبادات وعقاید میں ان کا نقطۂ نظر سوادِ اعظم سے کہیں متصادم نہ تھا۔مولانا حالیؔ علی گڑھ تحریک میں صحیح مذہبی روشنی کا فروغ چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے کوشش بھی کی۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا یہ کہنا صداقت سے خالی نہیں:

> "علی گڑھ تحریک نے حالیؔ کی شاعری کا رُخ موڑا تھا ، مسدّسِ حالی نے خود اس تحریک کا رخ قبلۂ مغرب سے مغربِ قبلہ کی طرف موڑ دیا۔اس سے پہلے تحریک کا مطمح نظر انگریزی اور انگریزیت کے سوا اور کیا تھا؟ لیکن مسدّس کا شاعر جب اپنی خودی میں ڈوب کر ابھرا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی کہ قوم کی اصلاح وترقی کے لیے مغرب کی اندھی تقلید درکار نہیں، اسلام کی ابدی تعلیمات اور تہذیبی اقدار ماضی کی طرح آج بھی بقا وارتقا کی ضامن ہیں۔" (۱۰)

(۳)

مسدّسِ حالی کو تخلیق ہوئے ۱۳۵ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی مقبولت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ یہ اب بھی ہر طبقے میں مقبول اور پسندیدہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ مختلف تعلیمی درجوں کے نصابات میں شامل رہی ہے اوراس کے بے شمار ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔مسدّس کی تخلیق سے لے کراب تک برعظیم پاک وہند طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔سیاسی، سماجی، جغرافیائی، تعلیمی،ادبی، اخلاقی اور اقتصادی شعبوں میں نت نئی تبدیلیوں کے باعث ان کے قواعد، معیارات، اسالیب اور انداز بھی بدل گئے۔اس عرصے کے دوران میں طرح طرح کی مقامی اور بین الاقوامی تحریکیں سرگرمِ عمل رہیں اور زندگی کے منظر نامے میں اپنا فعال کردار ادا کر کے رخصت ہوئیں۔ان تحریکوں نے اہلِ ہندو پاک کے قلب وذہن پر عارضی، ہنگامی یا دور رس اور دیر پا اثرات مرتب کیے۔حیرت کی بات ہے کہ ان تبدیلیوں اور ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مسدّسِ حالیؔ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں کمی نہیں آئی۔مسدّس کا یہ قبولِ عام اور شہرت ہی عہدِ حاضر میں اس کی معنویت کا اظہاریہ اور اس کی افادیت کا

اشاریہ ہے۔اثر وسوز میں ڈوبی ہوئی یہ عظیم الشان نظم آج بھی اقوام وافراد کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص فکری رہنمائی کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔مسدّس ِ حالی کے صدی ایڈیشن (۱۹۳۵ء) کی ایک تقریب میں سیّد سلیمان ندوی نے لکھا تھا:

> "اس مسدّس کی تالیف پر نصف صدی سے زیادہ گزر چکی مگر اس کے اثر کی تازگی کا اب بھی وہی عالم ہے۔امید ہے صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی جائیں گی لیکن ان اوراق پر سچائی اور اخلاصِ ملت کی تاثیر سے کہنگی نہ آئے گی۔یہ خود حیاتِ جاوید پائے گی اور اپنے مصنف کو حیاتِ جاوید بخشے گی اورجیسے اِس دُنیائے فانی میں وہ اِس کی شہرت کا سبب بنی، اُس دُنیائے باقی میں اس کی مغفرت کا سامان بنے گی۔''(۱۱)

مسدّسِ حالی نے اُردو شاعری کا مزاج، منہاج اور قبلہ تبدیل کردیا تھا،انھوں نے زلف ورخ کے خیالی افسانوں، ہجر وفراق کے مصنوعی قصوں اور عشق ومحبت کی جھوٹی داستانوں کے بجائے شاعری کو ملک وملت اور مذہب وقوم کی خدمت کا راستہ دکھایا تھا اور ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کئی شاعروں اور ادیبوں نے شعر وادب کو ان نئے موضوعات سے مالامال کر کے اسے نئے آفاق کی بشارت دی۔مسدّس قومی اور ملی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے اس لیے اُردو ادبیات میں قومی وملی شاعری کی تاریخ کو سمجھنے اور اس کے منشور کو جاننے کے لیے مسدسِ حالی کا مطالعہ ہر عہد کی ضرورت ہے۔

مسدّسِ حالیؔ مسلمانوں کے عروج وزوال کی سچی دستاویز اور ان کی تاریخ کا حقیقی مرقع ہے۔ مولانا حالیؔ نے پوری مسلم تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن اسباب وعوامل کو کھوج نکالا ہے جن کے باعث اسلاف سربلندی اور سرفرازی اور بیسویں صدی کے مسلمان ذلت ونکبت اور پریشاں حالی کا شکار ہوئے ہیں۔مولانا حالیؔ کا یہ تاریخی تجزیہ ہمیشہ مسلمانوں کی فکری رہنمائی کرتا رہے گا۔دُنیا کی دوسری اقوام وملل بھی اس سرچشمۂ صافی سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتی ہیں۔مولانا حالیؔ نے اپنے عہد کے مسلمانوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مختلف طبقوں کے جن خیالاتِ رزیلہ اور عاداتِ قبیحہ پر نشتر زنی کی تھی۔افسوس! ان طبقوں نے مولانا حالیؔ جیسے دردمند معالج کے حرفِ نصیحت پر کان نہیں دھرے اور اپنے اعمال وافعال کی اصلاح ودرستی کی مطلق کوشش نہیں کی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

آج اُن کے افعال واعمالِ قبیحہ کا زہر پوری سوسائٹی میں پھیل چکا ہے۔اس لیے مسدّسِ حالی کی جتنی ضرورت آج ہے شاید پہلے نہ تھی۔تعصب ،تنگ نظری، جھوٹ، خوشامد، خود غرضی، غرور وتکبر، بے حمیتی اور بے بصری کا دیمک معاشرے کو بُری طرح چاٹ رہا ہے۔وارثانِ منبر ومحراب، اصحابِ کتاب وقلم، شعرا وادبا،امرا واکابر، حکما ودانش ور اور دوسرے افراد اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہو کر جادۂ حق سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔اس لیے پورا معاشرہ ذلت ونکبت کی لپیٹ میں ہے۔تفرقہ بازی اور گروہ بندی نے جمعیت کو نقصان پہنچا کر افرادِ معاشرہ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت، بغض، حسد، کینہ اور حقارت کے امراض پیدا کر دیے ہیں۔قتل وغارت گری، ڈاکہ زنی،ناانصافی، حق نا شناسی، استحصال اور جہالت کے عفریت چار سو دندناتے پھرتے ہیں۔ڈیڑھ سو سال پہلے ذلت ونکبت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو مولانا الطاف حسین حالیؔ نے نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اس عذاب اور کرب سے نکلنے کا جو راستہ بتایا تھا،آج کے پریشان حال مسلمانوں کے لیے بھی وہی نسخۂ اکسیر ہے۔مولوی عبدالحق کا یہ قول صداقت سے خالی نہیں:

> "مسدّسِ حالی زندۂ جاوید کتابوں میں سے ہے۔اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گُر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔"(۱۲)

حوالہ جات

۱۔ ہمارے ہندستانی مسلمان:(اُردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق حسین)،لاہور،س ن ،ص ۲۴۹

۲۔ ''(ترجمۂ حالی'' مشمولہ: کلیاتِ نظمِ حالی:(جلد اوّل مرتب: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)؛ لاہور؛ مجلسِ ترقیِ ادب، اوّل،جولائی ۱۹۶۸ء، ص۱۰

۳۔ ایضاً: ص ۱۱

۴۔ ''دیباچہ'' مشمولہ: مسدّسِ حالی:(صدی ایڈیشن مرتب: ڈاکٹر سید عابد حسین) کراچی؛ اُردو اکیڈمی سندھ،چھٹی بار،۱۹۹۲ء، ص ۶۳ تا ۶۵

۵۔ مکتوباتِ سرسید: مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور؛ مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۲
۶۔ ایضاً، ص ۳۱۲
۷۔ ایضاً، ص ۳۱۳
۸۔ کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)، ص ۶۱
۹۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع پانزدہم، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۶
۱۰۔ کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)، ص ۶۱، ۶۲
۱۱۔ 'مقدمہ' مشمولہ مسدّسِ حالی (صدی ایڈیشن)، ص ۴۷
۱۲۔ "تقریب" مشمولہ مسدّسِ حالی (صدی ایڈیشن)، ص ۲۱